POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 December 2025, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

ہفت روزہ
ہماری زبان
HAMARI ZABAN
(Weekly)
اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 23-12-2025 • Price: 5/- • 1-7 January 2026 • Issue: 1 • Vol:85

یکم تا ۷ر جنوری ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱ • جلد:۸۵

میراجی کا شعری و نثری انفراد

مشتاق احمد

محمد ثناء اللہ ثانی ڈار میراجی (25 مئی 1912–3 نومبر 1949) تاریخِ ادبِ اردو کا ایک معتبر نام ہے لیکن ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ میراجی کی ادبی و علمی حیثیت کے تعینِ قدر میں ہمارے ناقدینِ ادب نے اپنے ذہنی تعصّبات و تحفظات کو پیشِ نظر رکھا ہے جس کی وجہ سے میراجی کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ ہنوز انصاف نہیں ہوسکا ہے۔ بیشتر سوانح نگاروں کی تحریروں کے مطالعے سے بس یہی پتا چلتا ہے کہ میراجی کی داستانِ زیست 'ایک حکایتِ رنگین' ہے اور ان کا عشق بھی یک طرفہ رہا ہے۔ ان کی شخصیت کے ذکر میں جنسی کج روی کو اولیت دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شبیہ متنازعہ فیہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کی شراب نوشی اور ان کی عجیب وغریب حرکت وکیفیت کو کچھ سوانح نگاروں نے اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ ان کی شاعری اور نثری خدمات پسِ پردہ چلی گئیں۔

میراجی کی شاعری کے تعلق سے بھی طرح طرح کی آرا قائم کی گئی ہیں۔ بیشتر ناقدینِ ادب نے ان کی شاعری میں جنسی پہلو تلاش کرنے میں ہی اپنا وقت ضائع کردیا ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ میراجی کی شاعری علامتی طرزِ اظہار کی بے مثال شاعری ہے۔ انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں اپنی تخلیقیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن میراجی نے روایتی شعری اظہار کو نہ اپنا کر اپنی نئی راہ بنائی اور آخر تک اسی راہ پر چلتے رہے۔ ان کی شاعری میں نفسیاتی گتھیاں ضرور ہیں لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری ہمارے لیے اَن بُجھ پہیلی ہے اور صرف اور صرف جنسی لذت کا سامان ہے۔ میراجی نے بجا لکھا ہے:

> ''بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا محض جنسی پہلو میری توجہ کا مرکز ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب وتمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے، اس لیے ردِعمل کے طور پر دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے۔ میرا آدرش ہے''۔

(بحوالہ: دھرتی پوجا کی مثال۔ میراجی، از ڈاکٹر وزیر آغا، مرتب: کمار پاشی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 1981)

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں ان کی شاعری اور ان کی شخصیت کا فکری ونظری محاسبہ کیا جا سکتا ہے اور میراجی کے ذہنی تلاطم کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی شاعر کے فکری اثاثے کا جائزہ لیتے وقت ان کی فکری وابستگی کی معلومات بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر شاعر کے بحرِ افکار ونظریات کی معنوی تہوں تک رسائی ناممکن ہے۔ میراجی حلقۂ اربابِ ذوق کے بنیاد گزاروں میں شامل تھے اور حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ شعرا اور ادبا کی فکری ونظری روش سے ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ حلقۂ اربابِ ذوق کے علم برداروں نے ترقی پسندیت کی تکذیب میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میراجی کی شاعری کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ جدید شعری ہیئتوں اور شعری تصورات کو فروغ دینے میں پیش پیش تھے۔ وہ ادب کے افادی تصور کے منکر تو نہیں لیکن اس کے زیادہ قائل بھی نہیں تھے۔ میراجی ادب کو عرفانِ ذات تصور کرتے تھے۔ میراجی کے تصورِ ادب اور تصورِ شعر کی روشنی میں جب ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے گا تو خود بخود یہ حقیقت عیاں ہوجائے گی کہ میراجی نے جدید اردو نظم کو کس قدر آفاقیت عطا کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

> ''جدید اردو نظم میں فراز سے نشیب کی طرف بڑھنے کا آغاز میراجی سے ہوتا ہے لیکن میراجی نے اپنی مدافعتی قوتوں کی مدد سے تحفظِ ذات کی کوشش بھی کی جس کے نتیجے میں تصادم اور آویزش کے متعدد پہلو اس کی نظموں میں ابھرتے چلے آئے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ میراجی سے اردو نظم کی ایک نئی جہت کا آغاز ہوتا ہے''۔

(اردو شاعری کا مزاج، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ:1997، ص:272)

میراجی کی تعلیم بھی محض رسمی تھی لیکن ان کے اندر بے پناہ ذہانت وفطانت تھی اور مطالعۂ کتب کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ادب کے ساتھ ساتھ دیگر علوم کی کتابوں میں دن رات غرق رہنا ان کا معمول بن گیا تھا۔ بالخصوص جب وہ 'ادبی دنیا' لاہور میں بطور نائب مدیر بحال ہوئے تو انھوں نے مشرق اور مغرب کی چیدہ چیدہ شعری ونثری تخلیقات کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا اور نظموں کا تجزیہ کرنے لگے۔ اس دور کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میراجی کا مطالعہ کتنا عمیق تھا۔ انھوں نے اپنے تجزیے کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اردو میں عملی تنقید کیا ہے۔ وہ مختلف النوع موضوعات پر لکھتے تھے، ادب کے علاوہ سیاسی مضامین میں بھی ان کی دلچسپی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ دور اردو زبان وادب میں غیر معمولی علمی وادبی صلاحیت رکھنے والوں کا تھا اور وہ کسی بھی تازہ دم قلم کاروں کی تخلیقات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی کمیوں کو اجاگر کرتے تھے اور باصلاحیت فنکاروں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی۔ بے جا شخصی قصیدہ خوانی یا تنقیص کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میراجی 1938 سے 1941 تک 'ادبی دنیا' سے وابستہ رہے اور اس دور میں انھوں نے نہ صرف اس رسالے کے معیار ووقار میں اضافہ کیا بلکہ ان کے اندر جو علمی وادبی چنگاری تھی اسے بھی شعلہ بنانے کا کام کیا۔ جیسا کہ محمد حسن عسکری نے لکھا ہے:

> ''میں نے رسالہ 'ادبی دنیا' پڑھ کر دیکھا تو نظم ونثر دونوں میں ذہنی اور جذباتی تازگی نظر آئی۔ اس دن سے میں 'ادبی دنیا' باقاعدہ پڑھنے لگا۔ کچھ تو میراجی کی ذاتی جاذبیت کی وجہ سے اور دو چار نظموں کے ان تجزیوں کی وجہ سے جو وہ ہر مہینے پیش کیا کرتے۔ ان تجزیوں میں جو بات سب سے نمایاں رہتی تھی وہ ایک نئی ادبی تحریک اور احساس کا ایک نیا انداز پیدا ہورہا ہے۔ شاعروں کی تعریف میں تو میراجی ضرور مبالغہ برتتے تھے لیکن اصل کوشش ان کی یہ رہتی تھی کہ نئے رجحانات اور اسالیب کو سمجھیں اور سمجھائیں''۔

(بحوالہ: میراجی: ایک مطالعہ، از ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:78، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ 1992)

میراجی نے صرف 37 سال کی عمر میں اس دارِفانی کو الوداع کہہ دیا لیکن اس قلیل عرصے میں انھوں نے دنیائے ادب کو جو بیش بہا قیمتی فکری ونظری اثاثے دیے، وہ گوہرِ نایاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میراجی کے گیت (1943)، میراجی کی نظمیں (1944)، گیت ہی گیت (1944)، پابند نظمیں (1968)، تین رنگ (1968)، میراجی کی نظمیں (مرتب: انیس ناگی 1988)، میراجی کی نظمیں (مرتب: مرغوب علی،

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

1990)،کلیاتِ میراجی (مرتب: ڈاکٹر جمیل جالبی، 1988)، باقیاتِ میراجی (مرتب: سیما مجید، 1990) کے سرسری مطالعے سے ہی میراجی کی شاعرانہ عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ان کی تنقیدی کتاب 'اس نظم میں' (1944) میراجی کی تنقیدی بصیرت و بصارت کا غماز ہے اور تراجم 'نگار خانہ' (1950)، 'مشرق و مغرب کے نغمے' (1958) اور 'خیمے کے آس پاس' (1964) اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ میراجی نے اردو میں فنِ ترجمہ کو کتنا کمال بخشا تھا۔

اس مختصر مضمون میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ ان کی نظم نگاری، ترجمہ نگاری، تنقید نگاری اور دیگر نثری تخلیقات پر تفصیلی بحث کی جا سکے۔البتہ میراجی کی نظموں کے موضوع اور اسلوب دونوں اردو نظم گوئی کے لیے خشتِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی نظموں کی ظاہری معنویت کا جہان کچھ اور ہے اور زیریں لہروں تک پہنچنے کے بعد قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں تہہ بہ تہہ ایک نئے جہانِ معنی سے روشناس کراتی ہیں۔ان کے یہاں ایک فطری بہاؤ ہے اور وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بھی آزاد ہیں۔ماضی، حال اور مستقبل کے دائرے میں محدود نہ رہ کر عصرِ حاضر اور فطرت کی لامحدودیت کے ساتھ ساتھ عظمتِ انسانی کے ترجمان نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کے پہلے مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی آسمانِ ادب میں مانندِ آفتاب و ماہتاب بن کر ابھرے۔ان کی نظم 'چل چلاؤ' نے اس قدر شہرت پائی کہ چہار طرف بس 'چل چلاؤ' کا ہی چرچا عام ہوا اور وہ نظم آج بھی اردو نظم نگاری میں موضوع، مواد اور تکنیک کے لحاظ سے ایک لافانی تحریر تسلیم کی جاتی ہے۔نظم ملاحظہ کیجیے:

بس دیکھا اور بھول گئے ؍جب حسن نگاہوں میں آیا
من ساگر میں طوفان اٹھا
طوفان کو چنچل دیکھ ڈری۔آکاش کی گنگا دودھ بھری
اور چاند چھپا تارے سوئے،طوفان مٹا، ہر بات گئی
دل بھول گیا، پہلی پوجا،من مندر کی مورت ٹوٹی
دل لایا باتیں انجانی، پھر دن بھی نیا اور رات نئی
پیتم بھی نئی، پریمی بھی نیا،سکھ سیج نئی، ہر بات نئی
اک پل کو آئی نگاہوں میں، جھلمل جھلمل کرتی سہیلی
سندرتا اور پھر بھول گئے
مت جانو ہمیں تم ہرجائی
ہرجائی کیوں، کیسے؟ کیسے؟
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہ کہلائے گی
جو بات ہو دل کی آنکھوں کی
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو
جتنی بھی جہاں ہو جلوہ گری اس سے دل کو گرمانے دو
جب تک ہے زمیں، جب تک ہے زماں
یہ حسن و نمائش جاری ہے
اس ایک جھلک کو چھچھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو
ہم اس دنیا کے مسافر ہیں
اور قافلہ ہے ہر آن رواں
ہر بستی، ہر جنگل صحرا اور روپ منوہر پربت کا
اک لمحہ من کو لبھائے گا، اک لمحہ نظر میں آئے گا
ہر منظر، ہر انسان کی دیا اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے، پل بیتا سب مٹ جائے گا
اس ایک جھلک کو چھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو؟
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی
ہے چاند فلک پر اک لمحہ
اور اک لمحہ یہ ستارے ہیں
اور عمر کا عرصہ بھی، سوچو اک لمحہ ہے (چل چلاؤ)

ایک دوسری نظم 'سلسلۂ روز و شب' کی قرأت کے بعد خود بخود یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ میراجی کی نظموں کی معنوی گہرائی و گیرائی کیا ہے:

خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلاء ہی خلاء ہے
سمٹے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ نورِ ازل مٹ چکا ہے
بہت دور انسان ٹھٹکا ہوا ہے
اسے ایک شعلہ نظر آرہا ہے
مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلاء ہے
تخیل نے یوں اس کو دھوکا دیا ہے
ازل ایک پل میں ابد بن گیا ہے
عدم اس تصور پہ جھنجھلا رہا ہے
نفس دو نفس کا بہانہ بنا ہے
حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے
تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا وہ کیا ہے
خلاء ہی خلاء ہے ، خلاء ہی خلاء ہے

مذکورہ دونوں نظمیں میراجی کی نظم نگاری کی قوسِ قزح کی حقیقت سے آشنا کراتی ہیں۔ظاہر ہے کہ میراجی کا ایک مخصوص انداز ہے۔ان کی نظمیں علامتی اور استعاراتی ہوتی ہیں مگر ان کا اندازِ بیان مکالماتی ہے اور یہی وصف انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے کہ ان کے یہاں موضوعاتی تنوع بھی ہے اور فکری تہہ داری بھی۔الفاظ کے نشست و برخاست کے معاملے میں وہ اس قدر محتاط نظر آتے ہیں کہ آپ اگر ان کی نظموں کے ایک لفظ کو ادھر سے اُدھر کر دیں تو پھر نظم کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

میراجی نے نظم کے مقابلے میں غزلیں کم کہی ہیں لیکن ان کے غزلیہ اشعار بھی پیش پا افتادہ مضامین سے پاک ہیں اور ایک نئی فضا کا احساس کراتے ہیں۔ان کی غزلوں میں بھی ان کی نظموں کی سی لہر دکھائی دیتی ہے اور گیت کی آہٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔ان کے یہاں ہندی الفاظ کو کھپانے کی بے مثال کوشش ہے اور وہ الفاظ بھی کانوں میں رس گھولنے والے معلوم ہوتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا
یاد کے پھیر میں آ کر دل پر ایسی کاری چوٹ لگی
دکھ میں سکھ ہے، سکھ میں دکھ ہے، بھید یہ نیا بھول گیا

طور اطوار انوکھے اس کے، کس بستی سے آیا ہے
پاؤں میں لغزش کوئی نہیں ہے، یہ کیسا مستانہ ہے

ڈھب دیکھے تو ہم نے جانا، دل میں دُھن بھی سمائی ہے
میراجی داتا تو نہیں ہے، عاشق ہے سودائی ہے

یک ہمہ حسن طلب ، یک ہمہ جانِ نغمہ
تم جو بیداد نہیں ہم بھی تو فریاد نہیں

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑ کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو، اور ہی کچھ سامان کریں

آنکھیں کھول کے دیکھ جگت کو، رنگ رنگ کی نیاری باتیں
ایک ہی چاند مگر آتا ہے، تیری راتوں کو چمکانے

میراجی نے گیت کو ایک نئی معنوی تہ داری اور فکری اڑان دینے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔اردو میں گیت گوئی کا چلن پہلے سے موجود تھا لیکن انھوں نے گیت کی ہیئت میں بھی تبدیلی کی اور اسلوب و مواد کے لحاظ سے بھی نئی فضا قائم کی۔انھوں نے اپنے گیت کو صرف ہجر و وصال کا نمونہ نہیں بنایا بلکہ انسانی جبلّت اور احساسات و جذبات کے مختلف رنگوں سے لبریز کرنے کی کوشش کی۔ان کے گیتوں میں ایک نئی فکری دنیا آباد نظر آتی ہے۔ان کے گیتوں میں کلاسیکی موسیقی کا آہنگ موجود ہے۔ان کے گیتوں میں قارئین و سامعین کے نہ صرف محظوظ کرنے کا سامان ہے بلکہ تہذیبی شائستگی کے گوہرِ نایاب بھی موجود ہیں۔

تنقید کے باب میں بھی میراجی نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی اور بالخصوص نظموں کے تجزیے میں عملی تنقید کے جو جوہر دکھائے وہ اردو شاعری کی تنقید میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے اپنے ہم عصروں کی نظموں کا تجزیہ کیا اور اس کی ادبی و تہذیبی قدریں متعین کیں۔روایتی تنقید کو خیر باد کہہ کر تخلیقیت کی اہمیت کا اعتراف کیا اور ان کمیوں کی بھی نشاندہی کی جن کی وجہ سے شاعری سپاٹ بن کر رہ جاتی ہے۔ان کے یہاں عملی تنقید کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تنقید کے عناصر بھی موجود ہیں۔مگر افسوس صد افسوس کہ ہمارے ناقدینِ ادب کو ان کے تنقیدی وژن کو سمجھنے میں چوک ہوئی اور میراجی کی تنقیدی بصیرت و بصارت کو موضوع نہیں بنایا گیا۔

جہاں تک میراجی کی ترجمہ نگاری کا سوال ہے تو انھوں نے عالمی ادب کے شہ پاروں سے اردو ادب کے قارئین کو روشناس کرایا اور اردو ترجمہ کے فن کو بھی ایک معیار و وقار بخشا۔اردو میں لفظی ترجمے کا چلن عام تھا لیکن میراجی نے لفظی ترجمے کے ساتھ ساتھ آزاد ترجمے کو اہمیت دی اور ترجمہ نگاری بھی تخلیقیت کا اعلا نمونہ بن سکتی ہے، یہ بھی ثابت کر دکھایا۔'مشرق و مغرب کے نغمے' کے متعلق فیض احمد فیضؔ نے بجا لکھا ہے:

''یہ تحریریں علمی، تحقیقی اور تاریخی دستاویز ہی نہیں ، ایک گراں قدر تخلیقی کارنامہ بھی ہیں۔ان کے توسط سے میراجی نے جس انداز سے ادبِ عالم کے حسین نمونے ہم تک پہنچائے وہ محض ترجمہ نہیں ایجاد ہے''۔

(بحوالہ: میراجی کا فن،ص:9)

میراجی نے غیر ملکی شعرا اور ادبا کی تخلیقات کا ترجمہ کرتے وقت اس نکتے کا خیال رکھا کہ ان کا ترجمہ مشرقی مزاج کا آئینہ دار ہو۔یہی وجہ ہے کہ نظموں کے ترجمے میں انھوں نے کہیں تخصیص کی تو کہیں اضافے بھی کیے لیکن اس کی تخلیقی معنویت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔انھوں نے نثری ترجمہ بھی کیا اور منظوم ترجمہ بھی لیکن ہر جگہ اپنی دانشورانہ تخلیقیت کا مظاہرہ کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے تراجم آج بھی اردو ترجمہ نگاری کے باب میں غیر معمولی علمی و ادبی اہمیت کے حامل تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ میراجی نے اردو شاعری، اردو تنقید اور ترجمہ نگاری کے باب میں اپنی مثالی تخلیقات کی بدولت امتیازی مقام حاصل کیا اور اردو کی نثری تاریخ میں بھی اپنی منفرد شناخت قائم کی۔مگر افسوس صد افسوس کہ میراجی کی شخصیت اور فن پر یک رخی بحث ہی کی جاتی رہی اور ان کی شاعری کو محض لذت طلبی کا سامان سمجھا گیا اور ان کی شخصیت کے حوالے سے بھی منفی رائے قائم کی گئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ میراجی کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی تخلیقیت کے ساتھ ساتھ ان کی دانشوری روایتی تنقید کی وجہ سے مجروح ہوتی رہی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ میراجی کو صرف اور صرف ایک جینوئن فنکار کی حیثیت سے پڑھا جائے، پرکھا جائے اور اردو ادب کے اس گوہرِ نایاب کی قدر و قیمت متعین کی جائے کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔

پروفیسر مشتاق احمد
پرنسپل، سی.ایم.کالج، دربھنگہ (بہار)
E-mail: rm.meezan@gmail.com
Mob. No. 9431414586

محبتوں اور خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر

انجینئر محمود اقبال

محبت میں ایک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

پتا نہیں جگر مرادآبادی نے یہ لافانی شعر کس موڈ میں اور کس کو مدِنظر رکھ کر کہا تھا۔لیکن یہ شعر محبتوں اور خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر پر پوری طرح سے صادق آتا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں 'طغیانی ہی طغیانی' ہے۔ انھوں نے نسوانی جذبات کی وہ بے مثال ترجمانی کی ہے کہ اس سے پہلے اردو ادب محرومِ دست وقلم تھا۔ پروین نے اپنے کلام میں وہ باتیں بھی پیش کی ہیں جو عموماً مستورات کہنے سے شرماتی اور ہچکچاتی ہیں۔ محبتوں کی شاعرہ نے صنفِ نازک کے احساسات اور جذبات کو صفحاتِ قرطاس پر قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح بکھیر دیا اور خوشبوؤں سے معطر کردیا ہے۔24 نومبر پروین شاکر کا یومِ پیدائش ہے۔ پروین نے 1952 میں کراچی کے ایک مہاجر گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ پروین شاکر کا پیدائشی نام سیدہ پروین بانو ہے۔ان کے والدِ محترم شاکر حسین ثاقب نے تقسیمِ ہند کے وقت پاکستان ہجرت کی تھی۔وہ بہار کے ضلع دربھنگہ کے علاقہ لہریا سرائے سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ان کے خاندان میں کئی نامی گرامی شاعر پیدا ہوئے تھے، جن میں بہار حسین آبادی کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔آپ کے نانا حسن عسکری اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے اور پروین کی توجہ شاعری کی طرف مبذول کرانے میں اُن کا بھی بڑا کردار رہا ہے۔

پروین شاکر نے 26 دسمبر، 1994 کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور دنیا بھر کے اردو والوں کو سوگوار کردیا تھا۔ ان کی ناگہانی وداعی بھلائے نہیں بھولی جاتی ہے۔صرف 42 سال کی مختصر سی عمر میں وہ ایک سڑک حادثے میں جاں بحق ہوگیں۔ اسلام آباد میں اپنے آفس جاتے وقت ان کی کار اور ایک بس میں ٹکر ہوگئی تھی اور پہلی طبی امداد ملنے سے پہلے ہی وہ دم توڑ گئی تھیں اور اسلام آباد ہی میں سپردِ خاک ہوئیں۔ ہم پروین شاکر کا 'یومِ پیدائش' منائیں یا 'یومِ ماتم'؟ اتنے برس گزر گئے ہیں لیکن اب بھی یقین نہیں آتا ہے کہ وہ ہم میں نہیں ہیں۔ پروین شاکر کی شادی ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پروین کے خالہ زاد بھائی بھی تھے اور پروین ان کی محبت میں شروع ہی سے گرفتار تھیں۔ وجوہات نامعلوم ہیں لیکن چند سال بعد نوبت طلاق تک آ گئی۔ پروین نے اس ناگہانی صدمے اور آپ بیتی کو بڑے ہی بے باکانہ الفاظ میں اپنے اس شعر کے ذریعے بیان کیا ہے:

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

ناکام محبت اور شادی کا ایک اکلوتا پھول مراد علی ہے جس کو شوہر کی بے وفائی کے بعد پروین نے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ مگر شومیِ قسمت کہ وہ بھی ان سے چھن گیا۔ کورٹ کے حکم کے بعد بیٹے مراد علی کو باپ کے حوالے کرنے پر وہ مجبور ہوگئی تھیں۔ بیٹے کی جدائی پر ان کی دکھ بھری داستان کچھ یوں ہے:

میں تجھ کو دیکھ سکوں آخری بصارت تک
نظر کے سامنے بس اک سماں گزرتا رہے

بیٹے مراد کا گھریلو نام یا عرفیت 'گیتو' تھا۔ اور وہی ان کی امیدوں اور زندگی کا واحد مقصد اور سہارا تھا۔ اور...وہ بھی ان سے چھن گیا! اور ایک لاچار اور مجبور ماں کی دنیا لٹ گئی۔ بقولِ احمد فراز:

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم
کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

پروین شاکر نہ صرف محبتوں کی شاعرہ تھیں بلکہ ایک اعلا تعلیم یافتہ خوب صورت اور باوقار خاتون بھی تھیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم کراچی میں ہوئی تھی۔ اسکول کے ابتدائی تعلیمی دور ہی سے وہ ادبی مزاج رکھتی تھیں۔ شاید یہ خوبیاں انھیں اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھیں۔ بچپن ہی سے ان میں ادبی ذوق وشوق تھا اور وہ تحریری اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی رہی تھیں۔ 25 سال کی عمر میں وہ پورے پاکستان میں ایک جانا پہچانا نام بن گئی تھیں۔ ریڈیو پر اور مشاعروں میں وہ اپنا کلام پڑھنے لگی تھیں۔ سرسیّد گورنمنٹ گرلس کالج کراچی سے انھوں نے انگریزی ادب اور لسانیات میں دو گریجویشن کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ یعنی ڈبل گریجویٹ تھیں۔ بعد ازاں کراچی یونیورسٹی سے انھیں دو ماسٹر ڈگریاں (ایم اے) حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ کام کے ساتھ ساتھ پڑھائی کرتے ہوئے ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ سے پبلک اڈمنسٹریشن میں ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کی بھی انھیں توفیق نصیب ہوئی (1991)۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے وہ پی ایچ ڈی کے لیے کوشش کررہی تھیں لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور وہ مقالہ پیش کرنے سے قاصر رہیں۔ کراچی یونیورسٹی کے عبداللہ کالج میں انھوں نے قریب نو سال تک درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے تھے، جہاں وہ طلبہ کو انگریزی ادب پڑھاتی تھیں۔ ان کی اعلا تعلیم اور اعلا عہدے کی جستجو میں ایک وقت ایسا دلچسپ موڑ بھی آیا، جس کی شاید انھیں بھی توقع نہیں تھی۔ پاکستان سول سپیریر سروسز (سی ایس ایس) کے امتحان ہال میں اردو کا پیپر لکھتے وقت ایک ایسا سوال آیا جس پر شاید وہ خود بھی دم بخود اور زیرِ لب مسکرانے پر مجبور ہوگئی ہوں گی۔ سوال ہی کچھ ایسا تھا؟ اور اس سوال کا شاید سب سے اچھا جواب بھی انھوں نے ہی لکھا ہوگا۔ کیوں کہ سوال پروین شاکر کی شاعری ہی کو لے کر تھا! امتحان میں پاس ہوکر وہ پاکستان کے ایک اہم محکمہ سے وابستہ ہوگئیں اور اسلام آباد میں ایک اعلا عہدے پر سکریٹری کے فرائض اپنی آخری سانس تک انجام دیتی رہیں۔ خوش قسمتی سے انھیں پاکستان کے مشہور ادیب وشاعر ندیم احمد قاسمی کی مربیانہ سرپرستی حاصل رہی تھی۔ پروین شاکر کی زیادہ تر غزلیں اور نظمیں ندیم صاحب کے رسالے 'فنون' میں چھپتی رہی تھیں۔ پروین کے اچھے برے وقت کے وہ ایک شفیق رہنما بنے رہے تھے۔ پروین کا پہلا شعری مجموعۂ کلام 'خوشبو' ہے جو 1977 میں منظرِ عام پر آیا تھا، اور اردو ادب پہلی مرتبہ لافانی نسوانی کلام کی چاشنی و روشنی سے روشناس وفیضیاب ہوا تھا۔ پروین کا پہلا شکوہ تھا!

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے، پھول کدھر جائے گا

پتا ہے آپ کو 'خوشبو' کے دیباچے میں پروین نے کیا لکھا تھا؟ 'جب ہولے سے چلتی ہوئی ہوا نے پھول کو چوما تھا تو خوشبو پیدا ہوئی تھی'۔ شاید یہ ایک نوجوان دوشیزہ کے شوخ وشنگ جذبات ہی کا یہ اظہارِ جرأت ہے اور یہ پروین ہی کا کمال ہے کہ اتنے خوب صورت پیرایے میں بیان کیا ہے۔ ابتدا میں وہ 'بینا' کے نام سے لکھا کرتی تھیں اور بعد میں پروین شاکر کے نام سے مشہور ہوئیں۔ خوشبو کے بعد 'صد برگ' (1980)، 'خود کلامی' (1990)، شعری مجموعے سامنے آئے۔ پروین کی زندگی ہی میں ان کی چوتھی کتاب 'انکار' 1990 میں آئی۔ بعد از مرگ 1996 میں 'کفِ آئینہ' شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ پروین شاکر اخبارات میں کالمس بھی لکھا کرتی تھیں جو 'گوشۂ چشم' کے نام سے معروف ہے۔ 'ماہِ تمام' (1994) ان کی کلیات ہے۔ محبتوں کی شاعرہ کی شاعری نسوانی احساسات، انسانی جذبات، تنہائی، کرب وملال اور حسن ورعنائی کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ پروین شاکر کی کچھ ایسی دکھ بھری غزلیں اور نظمیں بھی ہیں کہ جب وہ انھیں مشاعروں میں پڑھتی تھیں تو بے ساختہ داد کے بجائے سامعین کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ اپنے ہم عصر شاعرات جیسے کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض وغیرہ میں انھوں نے ایک منفرد مقام بنالیا تھا، لیکن یہ بھی ان کی اعلا ظرفی تھی کہ انھوں نے اپنے ہم عصروں کے کلاموں کی بھی تعریف کی اور کہتی تھیں کہ میں اپنی ساتھی خواتین شعرا کو بھی پڑھتی ہوں۔ پاکستان کے پُروقار 'آدم جی ایوارڈ' سے وہ 1978 میں نوازی گئیں اور 1991 میں 'پرائڈ آف پرفارمنس' کے علاوہ دیگر انعامات انھوں نے حاصل کیے تھے۔ پروین شاکر کی کتابوں کے ترجمے انگریزی، جاپانی اور ہندی زبانوں میں ان کی زندگی ہی میں ہونا شروع ہوگئے تھے۔ پروین شاکر کی شاعری الفاظ اور جذبات کا ایک حسین امتزاج ہے۔

1988 میں نئی دلی میں منعقدہ عالمی اردو کانفرنس میں شرکت فرما کر پروین شاکر نے نہ صرف اس کانفرنس کی شان بڑھائی تھی بلکہ بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کے ذریعے اس کانفرنس کو یادگار بنادیا تھا۔ اس موقعے پر ان کی ملاقات خوشونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، نامور مصور ایم ایف حسین اور کامنا پرشاد وغیرہ سے ہوئی اور وہ لمحات ورونقیں اردو والوں کے ذہنوں میں انمٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی ایک ساتھی اور سہیلی رفاقت جاوید نے پروین کی ایک کہانی بیان کی ہے کہ پروین نے ان کے پاس سے مستعار لیے ہوئے کچھ زر وزیورات یہ کہہ کر واپس کیے تھے کہ 'زندگی کا کیا بھروسہ، کیا خبر، رفاقت'۔ کیا پروین کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کا وقت قریب آرہا ہے؟ اللہ جانے! پروین نے یہ بھی کہا تھا:

کبھی عرش پر کبھی فرش پر کبھی ان کے در کبھی در بدر
غمِ عاشقی ترا شکریہ میں کہاں کہاں سے گزر گیا

ایک خبر ایک ہندستانی صحافی جناب رضوان احمد کے حوالے سے بھی ہے کہ جب 1977 میں پروین شاکر شنکر شاد مشاعرے میں شرکت کے لیے دلی تشریف لائیں تو انھیں دربھنگہ میں اپنے آبائی مکان کو دیکھنے کا بھی موقع ملا تھا۔ یہ مشاعرہ دلّی کے پرگتی میدان میں ہوا تھا۔ اس کا افتتاح اٹل بہاری واجپائی جی نے کیا تھا جو اُس وقت وزیرِ خارجہ ہوا کرتے تھے۔ دلچسپ کہانی یہ ہے کہ پاکستان سے آئے ایک شاعر سرور بارہ بنکوی نے اٹل جی سے درخواست کی کہ ہم اپنے آبائی وطن بارہ بنکی میں اپنی والدہ سے ملنا اور انھیں دیکھنا چاہتے ہیں اور ہمارے پاس وہاں کا ویزا اور کاغذات نہیں ہیں۔ کیا کریں؟ اٹل جی کی ...

(بقیہ صفحہ 6 ر)

اردو دُنیا

اساتذہ کے مسائل کے فوری حل کی اپیل

تلنگانہ اسٹیٹ پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن کا حکومت سے مطالبہ

حیدرآباد (25 دسمبر) ۔تلنگانہ اسٹیٹ پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن (ٹی ایس پی ٹی اے) کے ریاستی صدر سیّد شوکت علی نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ صورتِ حال کے قابو سے باہر ہونے سے قبل اساتذہ سے متعلق تمام زیرِ التوا بلوں کو یک مشت ادا کیا جائے۔ وہ ٹی ایس پی ٹی اے کے ریاستی دفتر میں منعقدہ ریاستی عاملہ کے اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے الزام عائد کیا کہ ریاستی حکومت اساتذہ اور محکمۂ تعلیمات کے ملازمین کے مسائل کو یکسر نظرانداز کر رہی ہے۔ وزیرِ اعلا سے ملاقات کے لیے متعدد بار کوششیں کی گئیں لیکن تمام تر کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرف جمہوری حکومت ہونے کا دعوا کیا جاتا ہے اور دوسری طرف وزیرِ اعلا کے دفتر کے عہدیداروں تک رسائی بھی ممکن نہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اساتذہ اپنے مسائل کس کے سامنے رکھیں، یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ سیّد شوکت علی نے مطالبہ کیا کہ اگر وزیرِ اعلا کو واقعی اساتذہ کے وقار اور احترام کا احساس ہے تو فوری طور پر ان کے دفتر میں اساتذہ تنظیموں سے رابطہ منقطع کرنے والے عہدیدار کو برطرف کیا جائے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ حکومت کو دو سال مکمل ہو چکے ہیں مگر اب تک وزیرِ تعلیم نے اساتذہ تنظیموں کے ساتھ ایک بھی باضابطہ اجلاس منعقد نہیں کیا۔ اساتذہ سے مشاورت کے بغیر یک طرفہ طور پر تعلیمی پروگرام نافذ کیے جا رہے ہیں جو نہ صرف قابلِ اعتراض بلکہ غیر سائنسی اور نقصان دہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی شعبے میں درپیش مسائل کے حل کے لیے وزیرِ اعلا فوری طور پر اجلاس منعقد کریں اور واضح لائحۂ عمل تیار کریں۔ اساتذہ پر بوجھ بن چکے ایف ایل این پروگرام کو منسوخ کرتے ہوئے طلبہ پر مرکوز تدریس کو فروغ دینے کی ضرورت ہے، لہٰذا اسے فوری طور پر منسوخ کیا جائے۔ ایسوسی ایشن کے صدر نے حکومت کی تعلیمی پالیسی کو زمینی حقائق سے بعید قرار دیتے ہوئے کہا کہ عملہ اور بنیادی سہولیات کی شدید کمی کے باوجود نئے تجربات کے نام پر سرکاری اسکولوں کو کمزور کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے تمام پرائمری اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے منظور کرنے، اپر پرائمری اسکولوں میں گزیٹڈ ہیڈ ماسٹر تعینات کرنے اور پرائمری تعلیم کے لیے علاحدہ ڈائرکٹوریٹ قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے ان سروس اساتذہ کو ٹی ای ٹی سے استثنیٰ کے لیے سپریم کورٹ میں دائر نظرِ ثانی عرضی کو جلد نمٹانے، ہر کلاس کے لیے ایک استاد مقرر کرنے اور تعلیمی انتظامیہ میں ماہرین کی موجودگی میں کھلی بحث منعقد کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ اجلاس میں دوسرے ذمے داران نے بھی خطاب کیا۔ بعد ازاں ریاستی کونسل نے متعدد اہم مطالبات پر مشتمل 35 نکاتی قراردادیں متفقہ طور پر منظور کیں، جن میں اسکول گرانٹس کمیشن کا قیام، نئی قومی تعلیمی پالیسی کی مخالفت اور پرائمری تعلیم کے لیے علاحدہ ڈائرکٹوریٹ کے قیام جیسے مطالبات شامل ہیں۔ (اعتماد۔حیدرآباد)

اردو سے 'پی ایم یوا' کے لیے استوتی اگروال منتخب

سرونج (27 دسمبر)۔ مرکزی وزارتِ تعلیم اور نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا (این بی ٹی) نے پرائم منسٹرس ینگ آتھرز میٹورشپ اسکیم (پی ایم یوا) کے تیسرے اڈیشن کے نتائج کا اعلان کیا ہے جس میں 22 زبانوں کے 43 نوجوان قلم کار منتخب کیے گئے ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ اس اسکیم کا مقصد 30 برس تک کی عمر کے نوجوان قلم کاروں کی تربیت کرنا اور ہندستانی تہذیب کو فروغ دینا ہے۔ اردو زبان سے استوتی اگروال اور محمد یوسف کا انتخاب ہوا ہے۔ این بی ٹی نے ان قلم کاروں سے تین مختلف موضوعات پر مسودے طلب کیے تھے۔ مسودے کے انتخاب کے بعد انھیں انٹرویو کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ استوتی نے 'انڈین نالج سسٹم' کے ذیلی عنوان 'قدیم ہندستانی صحائف کی تعلیمات اور اہمیت' پر مسودہ جمع کیا تھا۔ اس اسکیم کے تحت این بی ٹی اُن کو میٹورشپ فراہم کرے گی اور بعد از چھے ماہ اضافہ شدہ مسودے کو کتابی شکل میں شائع کرے گی۔ پچاس ہزار روپے ماہانہ کے طور پر 6 ماہ تک انھیں اسکالر شپ اور تاحیات 10 فیصد رائلٹی بھی ملے گی۔ واضح رہے کہ استوتی اگروال کا تعلق مدھیہ پردیش کے قصبے سرونج سے ہے۔ وہ سہ ماہی 'انتساب' کے سرپرست انل اگروال اور گیتا اگروال کی صاحبزادی ہیں اور دو مشہور اردو رسائل سہ ماہی 'انتساب' اور ماہنامہ 'عالمی زبان' کی نائب مدیرہ ہیں۔ اُن کی ترجمہ کردہ کتاب 'انسانیت اور محبت کا شاعر ساحر لدھیانوی' (انگریزی سے اردو) گذشتہ برس منظرِ عام پر آئی ہے۔ پروفیسر خالد محمود پر ایک کتاب سیفی سرونجی کے ساتھ ترتیب بھی دی ہے۔ اس موقعے پر استوتی نے اپنی کامیابی کا سہرا اپنے والدین اور اساتذہ کے سر باندھا ہے۔ (انقلاب۔دہلی)

فرحت احساس کی کلیات 'مجھ کو مری یاد آ رہی ہے' (اردو/ دیوناگری) کی رسمِ اجرا

فرحت احساس کے یومِ ولادت کے موقعے پر یادگار تقریب

نئی دہلی (پریس ریلیز، 26 دسمبر)۔ معروف شاعر، دانشور اور مفکر فرحت احساس کی تازہ تصنیف 'مجھ کو مری یاد آ رہی ہے' کی رسمِ اجرا 25 دسمبر 2025 کو ان کے یومِ ولادت کے موقعے پر امپیسڈ رہوٹل، نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس خوشگوار موقعے پر اہلِ قلم، دانش وروں، ممتاز ادبی شخصیات اور ادب دوستوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

تقریب کا آغاز شام 6 بجے مہمانوں کی آمد اور ضیافت سے ہوا، جب کہ باقاعدہ پروگرام کا آغاز شام 7 بجے شاعر اور ناظمِ تقریب چراغ شرما کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے تقریب کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرحت احساس کی ادبی خدمات اور فکری قدر و قیمت کا جامع تعارف پیش کیا۔

اس موقعے پر فرحت احساس کی شاعری اور شخصیت پر مبنی ایک خصوصی ڈاکیومنٹری پیش کی گئی، جسے حاضرین نے بے حد توجہ اور تحسین کے ساتھ دیکھا۔

کتاب کی باضابطہ رسمِ اجرا کے مرحلے میں فرحت احساس کے ہمراہ ریختہ فاؤنڈیشن کی ٹرسٹی اور کریئیٹو ڈائرکٹر ہما خلیل، ریختہ فاؤنڈیشن کے بانی سنجیو صراف، معروف فکشن رائٹر خالد جاوید، اسا سلیم اور منیش شکلا اسٹیج پر موجود رہے، جہاں کتاب کی رونمائی عمل میں آئی۔ بعد ازاں منعقدہ اسپیکر زسیشن میں بینش خان، مقدسہ سلیم، اسا سلیم، خورشید اکرم اور خالد جاوید (بیسویں صدی فرحت احساس کے نام سے جانی جائے گی) نے فرحت احساس کی شاعری، ان کے فکری تنوع اور ادبی مقام پر سیر حاصل گفتگو کی اور انھیں عہدِ حاضر کی ایک منفرد، توانا اور بااثر تخلیقی آواز قرار دیا۔

تقریب کے اختتامی مرحلے میں فرحت احساس نے حاضرین سے خطاب کیا اور اپنی منتخب شاعری سنائی، جسے سامعین نے گہری توجہ اور بھرپور داد کے ساتھ سنا۔

آخر میں سنجیو صراف نے اظہارِ تشکر کیا اور فرحت احساس کے ساتھ اپنے دوستانہ مراسم کے حوالے سے گفتگو فرمائی۔ کلیات کے حوالے سے انھوں نے کہا: فرحت احساس کی کلیات 'مجھ کو مری یاد آ رہی ہے' اردو کے باب میں عظیم اضافہ ہے۔

یہ تقریب نہ صرف فرحت احساس کے یومِ ولادت کی خوشی کا اظہار تھی بلکہ اردو زبان و ادب کے لیے بھی ایک یادگار لمحہ ثابت ہوئی، امید ہے کہ ان کی کلیات 'مجھ کو مری یاد آ رہی ہے' کو ادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی حاصل ہوگی۔

تلنگانہ میں 1400 سے زائد سرکاری اسکول عارضی طور پر بند

حیدرآباد (24 دسمبر)۔ ریاستِ تلنگانہ میں محکمۂ اسکول ایجوکیشن نے ایک اہم فیصلہ کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ تعلیمی سال 26-2025 کے لیے یونافائیڈ ڈسٹرکٹ اسکول ایجوکیشن انفارمیشن سسٹم (UDISE) کے اعداد و شمار میں 1400 سے زائد ایسے سرکاری اسکول شامل نہیں کیے جائیں گے، جن میں اس وقت ایک بھی طالبِ علم زیرِ تعلیم نہیں ہے۔ ان اسکولوں کو عارضی طور پر 'نان آپریشنل' تصور کیا جائے گا۔ محکمے کے مطابق ریاست میں اس وقت مجموعی طور پر 2,245 ایسے سرکاری اسکول ہیں جہاں کوئی بھی طالبِ علم موجود نہیں ہے۔ ان میں سے 2000 سے زائد اسکول محکمۂ اسکول ایجوکیشن کے دائرۂ اختیار میں آتے ہیں۔ ان میں 1441 اسکول ایسے ہیں جہاں نہ طلبہ ہیں اور نہ ہی اساتذہ کی کوئی منظور شدہ پوسٹ، جب کہ تقریباً 600 اسکول ایسے ہیں جہاں اساتذہ کے موجود ہونے کے باوجود کوئی طالبِ علم نہیں ہے۔ فی الحال 1441 اسکولوں کو عارضی طور پر بند رکھا جائے گا۔ جب کہ باقی 600 اسکول اور دیگر محکمہ جات کے تحت آنے والے تقریباً 200 زیرو اسکولوں کے بارے میں بعد میں فیصلہ کیا جائے گا۔ محکمے کے ایک اعلا عہدیدار نے واضح کیا کہ یہ فیصلہ حتمی نہیں ہے۔ اگر کسی گاؤں یا علاقے کے لوگ اپنے بچوں کو دوبارہ اسکول بھیجنے کا مطالبہ کریں گے تو فوری طور پر اسکول کھول دیا جائے گا اور ایک ٹیچر کا بھی تقرر کیا جائے گا۔ عہدیدار نے یہ بھی یاد دلایا کہ حکومت کی جانب سے حال ہی میں دور دراز اور مضافاتی علاقوں کے عوامی مطالبات کے پیشِ نظر 200 نئے سرکاری اسکول قائم کیے گئے ہیں۔ مرکزی وزارتِ تعلیم ہر سال UDISE کے تحت اسکولوں سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرتی ہے جن کی بنیاد پر ریاستوں کے پرفارمنس گریڈنگ انڈیکس (PGI) اسکور دیا جاتا ہے۔ اس اسکور میں اسکولوں کی تعداد، اساتذہ، طلبہ کی تعداد، زیرو اسکول اور طلبہ و اساتذہ کا تناسب جیسے عوامل شامل ہوتے ہیں۔ اگر زیرو اسکولوں کی تعداد زیادہ ہو تو PGI اسکور متاثر ہوتا ہے۔ ذرائع کے مطابق یہی وجہ ہے کہ ملک کی بیشتر ریاستیں UDISE کے اعداد و شمار میں زیرو اسکولوں کی مکمل تفصیل شامل نہیں کرتی۔ اس تناظر میں تلنگانہ میں زیرو اسکولوں کو UDISE ڈیٹا سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ریاست کی تعلیمی کارکردگی متاثر نہ ہو۔ (سیاست۔حیدرآباد)

اُردو زبان وادب کا پہلا محقق و مدرس

جان بارتھ وِک گل کرسٹ

تالیف وترجمہ

صدیق الرحمٰن قدوائی

قیمت: 250 روپے

پورٹل پر TAIT-3 کے تحت اردو میڈیم اساتذہ کی بھرتی کے لیے ضلع میں تمام منظور شدہ اور خالی اسامیوں کو فوری طور پر اپ لوڈ کرنے کے متعلق اکھل بھارتیہ اردو شکشک سنگھ کی جانب سے یادداشت پیش

پربھنی (21 دسمبر)۔ ریاستی حکومت کی جانب سے TAIT-3 امتحان کا اعلان کیا گیا ہے اور اردو میڈیم اساتذہ کی بھرتی کا عمل جلد ہی شروع کیا جائے گا۔ اس کے باوجود ضلع ہنگولی کے کئی اردو میڈیم اسکولوں میں منظور شدہ اور خالی اسامیوں کی معلومات ابھی تک پوٹل پر اپ لوڈ نہیں کی گئی ہے جو کہ ایک انتہائی سنگین معاملہ ہے اور بھرتی کے عمل میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔ حکومتی فیصلوں، ایجوکیشن کمشنریٹ کے احکامات اور بھرتی کے عمل میں شفافیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمام انتظامیہ پر بروقت معلومات اپ لوڈ کرنا لازمی ہے تاہم صاف نظر آ رہا ہے کہ اس معاملے کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ اس سے اہل اُردو امیدواروں کو کافی نقصان ہو رہا ہے اور انتظامیہ کی کارکردگی پر برہمی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اساتذہ نے متفقہ طور پر مطالبہ کیا ہے کہ اردو میڈیم اساتذہ کی بھرتی سے متعلق خالی اسامیوں کی معلومات فوری طور پر پورٹل پر اپ لوڈ کی جائیں بصورتِ دیگر اردو اساتذہ اور امیدواروں میں شدید عدمِ اطمینان کا خدشہ ہے۔ محکمۂ تعلیمات کے افسران اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے اور متعلقہ لوگوں کو واضح اور سخت حکم دینا چاہیے کہ ہنگولی ضلع کے تمام اردو میڈیم اسکولوں میں منظور شدہ اور خالی اسامیوں کے بارے میں مکمل معلومات فوری طور پر پورٹل پر اپ لوڈ کریں تاکہ TAIT-3 کے تحت اردو اساتذہ کی بھرتی کا عمل بغیر کسی رکاوٹ اور منصفانہ طریقے سے ہو سکے۔ خیال رہے کہ اگر وقت پر کارروائی نہیں کی گئی تو اکھل بھارتیہ اردو شکشک سنگھ کے پاس اعلا حکام سے پیروی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ اس بات کو اچھی طرح سے ذہن نشیں کر لیں۔ (اردو ٹائمز۔ ممبئی)

پریم چند کی ذہن سازی میں ملک کے سیاسی حالات کے ساتھ گھریلو ماحول کا بھی اہم کردار ہے: پروفیسر علی احمد فاطمی

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی جشنِ غالب تقریبات کا افتتاح

نئی دہلی (پریس ریلیز، 26 دسمبر)۔ منشی پریم چند نے جب ہوش سنبھالا تو سرشار، رسوا اور یلدرم وغیرہ کے ذریعے ماحول بن چکا تھا، سیاسی اور سماجی عناصر ادب کا حصہ بن رہے تھے لیکن پھر بھی پرانی طرزِ تحریر کا کہرا ابھی باقی تھا۔ دراصل پریم چند کو پریم چند بنانے میں اس وقت کے ہنگامی ماحول کے علاوہ ان کا اپنا گھریلو ماحول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بنارس کا لمہی گاؤں اور نچلے متوسط طبقے کی زندگی، سوتیلی ماں کا رویہ، کسانوں اور مزدوروں کی تباہ حالی، کم عمری میں ذمے داریوں کا بوجھ ان سب عناصر نے مل کر پریم چند کے ذہن کو ایک سانچے میں ڈھالا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر علی احمد فاطمی نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام منعقدہ بین الاقوامی سمینار ’منشی پریم چند: ذہن، زمانہ اور آرٹ‘ کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ معروف مترجم اور ادبی تاریخ نویس ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال غالب کے یومِ ولادت کی مناسبت سے بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کرتا ہے اور اس موقعے پر سمینار کے لیے جن موضوعات کا انتخاب ہوتا ہے ان میں اپنے زمانے کی سمت و رفتار کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ پریم چند پر ہندی اور اردو میں جو کچھ لکھا گیا اس کا تجزیہ اور نئے گوشوں کی تلاش اس سمینار کا بنیادی مقصد ہے۔ سمینار کا افتتاح ہندی کے معروف ادیب و شاعر جناب اشوک واجپئی نے کیا۔ انھوں نے کہا پریم چند بلاشبہ عظیم فنکار ہیں، ان کی تمام تحریریں اگر پیشِ نظر ہوں تو وہ مذہب، نسل وغیرہ کی تفریق سے بالاتر نظر آئیں گی۔ ان کا اصل مسئلہ انسانیت اور اس کے تقاضے و فرائض ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے صدارتی تقریر کے دوران کہا ہم اپنے اسکول کے زمانے سے پریم چند کو پڑھ رہے ہیں اور آج بھی ان کا مطالعہ زندگی کے کسی نئے تجربے کا احساس دلاتا ہے۔ اب میں پریم چند کو کسی اور نظر سے دیکھتا ہوں اور یقیناً ادبی معاشرے کے زاویوں میں بھی تبدیلی آئی ہوگی، اس تبدیلی کو مذاکرے کا موضوع بنانا ہماری اجتماعی تفہیم کو آگے بڑھائے گا۔ پروفیسر آلوک رائے (پریم چند کے پوتے) نے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے کہا پریم چند کو ہم یہاں یاد کرنے جمع ہوئے ہیں، اس اعتبار سے ہماری آمد اور شرکت ایک تاریخی لمحے اور موقع کی گواہ بھی بننے والی ہے۔ جلسے تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر پریم چند پر انٹرنیشنل سمینار کا ہونا خود ہمیں داخلی طور پر حوصلہ دیتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پریم چند ہمارے درمیان اپنی سادگی اور سچائی کے ساتھ موجود ہیں۔

پروفیسر پروشوتم اگروال نے اس جلسے میں بطور مہمانِ ذی وقار شرکت کی۔ انھوں نے کہا پریم چند نے زمانے کو جس نظر سے دیکھا وہ پہلی نظر میں بہت عام لگتا ہے لیکن اس میں گہرائی بہت ہے۔ ان کے جو احسانات ہمارے ادب اور تہذیب پر ہیں، ان کی شکرگزاری اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم نئے سرے سے ان کی طرف متوجہ ہوں۔ پروفیسر اپوروانند نے کہا پریم چند کی تخلیقات میں کسان، مزدور، عورت اور پسماندہ طبقوں کو مرکزیت حاصل ہے۔ ان کو آسان لکھنے والا یا فقط اخلاقیات کا رہبر کہہ کر ٹالنا مناسب نہیں ہے بلکہ وہ اقتدار، استحصال اور پسماندہ طبقے کے مسائل کو فنی ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے اظہارِ تشکر کے دوران کہا غالب تقریبات جو ہر سال دسمبر میں ہوتی ہیں اس کے موضوعات ادبی دنیا میں نئے مباحث کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ پریم چند پر دلّی میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا انٹرنیشنل سمینار ہے۔ اس کا عنوان بھی یعنی پریم چند: ذہن، زمانہ اور آرٹ بڑی حد تک پریم چند کی تخلیقات اور زمانے سے ان کے رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم نے اپنی وراثت کو نئے سرے سے دیکھنے کا ایک موقع فراہم کیا ہے۔ افتتاحی اجلاس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات ’فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے‘، ’غالب کے خطوط انتخاب‘ مرتبہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ’پنڈت رتن ناتھ سرشار: شخص عہد اور تخلیقی جہات‘ مرتبہ ڈاکٹر ادریس احمد، ’پروفیسر عبدالستار دلوی: محقق اور دانشور‘، ’خواجہ حیدر علی آتش اور ان کا عہد‘، ’غالب کے تین اہم معاصرین صہبائی، آزردہ اور شیفتہ‘، ’جنوبی ہند میں غالب شناسی‘، ’غالب شناسی عہدِ حاضر کے آئینے میں‘، مرتبہ ادریس احمد، ’غالب کی شاعری میں نشاط و غم‘ مرتبہ پروفیسر ثروت خان، ’پریم چند: تنقیدی تناظرات‘ مرتبہ پروفیسر سرورالہدیٰ۔ غالب نامہ کے دو شمارے، جولائی 2025 اور جنوری 2026، ڈائری، کلینڈر 2026۔ غالب تقریبات کے موقعے پر منشی پریم چند کی تصویروں اور ان کی مطبوعات کی نمائش کا افتتاح پریم چند کے پوتے پروفیسر آلوک رائے کے دستِ مبارک سے ہوا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شامِ غزل کا اہتمام ہوا جس میں ملک کی معروف غزل سرا محترمہ ودیا شاہ نے غالب اور دوسرے اہم شعرا کا کلام پیش کیا۔

مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کی سالانہ ایوارڈ تقریب

مختلف شعبوں کی نمایاں شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا

نئی دہلی (9 دسمبر)۔ مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کی جانب سے ہر سال کی طرح امسال بھی مولانا کے یومِ پیدائش کے موقعے پر 10 دسمبر کو تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر، نئی دہلی میں سالانہ جلسہ تقسیمِ ایوارڈ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر سیّد فاروق نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر وی. پی. سنگھ طور نے شرکت کی۔ جن شخصیات کو اُن کی گراں قدر خدمات کے لیے مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ سے نوازا گیا، اُن میں شیورندر تومر، ڈاکٹر سحر قریشی اور ڈاکٹر محمد عزیز ذکائی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اس سال کا بی اماں ایوارڈ محترمہ عابدہ پی انعامدار، جب کہ ادیب و شاعر اور صحافی رؤف رامش کو برائے صحافت ایم سلیم میموریل ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس پُروقار تقریب میں بڑی تعداد میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے شرکت کی جن میں عبید خورشید، عرفان اعظمی، ڈاکٹر عفیفہ رحمان، طالب سراج، ڈاکٹر ایم. آر. قاسمی، منور حسن کمال، اسرار رازی، ارشد صدیقی اور محمد عُمید الرحمٰن وغیرہ شامل تھے۔ محفل کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس موقعے پر خواجہ محمد شاہد، ڈاکٹر ڈی پی سنگھ اور تسمیہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سیّد فاروق نے مولانا محمد علی جوہر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آخر میں اکیڈمی کے جنرل سکریٹری احمد ندیم خاں نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

حمید سہروردی متنوع اسالیب کے تخلیق کار
رؤف صادق کی مرتبہ کتاب ’پایان‘ کی رسمِ اجرا

ممبئی (22 دسمبر)۔ بزمِ شمس رمزی ممبئی کے زیرِ اہتمام 21 دسمبر 2025 کو آٹھ بجے شب ملّت اردو ہائی اسکول گیٹ نمبر پانچ مالونی ملاڈ ویسٹ ممبئی میں معروف اردو شاعر، ادیب اور مصور جناب رؤف صادق کی مرتبہ کتاب ’پایان‘ (حمید سہروردی کی منتخب تخلیقات) کی رسمِ اجرا جناب شیخ علیم الدین علیم کے ہاتھوں انجام پائی۔ تقریب رسمِ اجرا کی صدارت مشہور شاعر جناب شجاع الدین شاہد نے کی۔ جناب علیم الدین علیم نے کتاب ’پایان‘ کی رسمِ اجرا انجام دینے کے بعد کہا کہ یہ میرے لیے بڑا اعزاز ہے کہ میرے ہاتھوں سے کتاب کا اجرا انجام پایا۔ انھوں نے حمید سہروردی کی منتخب تخلیقات کی خوب صورت پیش کش پر مرتبِ کتاب جناب رؤف صادق کو مبارک باد پیش کی۔ جناب شجاع الدین شاہد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کتاب ’پایان‘ حمید سہروردی کی گراں قدر تخلیقات کا حسین گلدستہ ہے جس کے پھولوں کی مہک تادیر قائم رہے گی۔ انھوں نے رؤف صادق کی تدوینی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ کتاب ’پایان‘ کو انھوں نے بڑی محنت اور محبت سے مرتب کیا ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے حمید سہروردی کی نظم ’نئی نسل کے نام‘ سنائی اور اس کی تشریح بھی بیان کی۔ تقریب کے کنوینر اور شاعر جناب شاذ رمزی نے اپنے رفیقِ دیرینہ رؤف صادق کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی اور حمید سہروردی کی تخلیقات کو خوب سے خوب تر انداز میں پیش کرنے پر مبارک باد پیش کی۔ مرتبِ کتاب جناب رؤف صادق نے اپنے تاثرات میں تمام شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حمید سہروردی سے ان کے مراسم پچاس برس سے ہیں۔ حمید سہروردی کی تحریروں سے وہ متاثر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا ان کی مرتبہ کتاب ’حمید سہروردی کی منتخب تخلیقات‘ ان کی پسندیدہ تخلیقات ہیں۔ انھوں نے کہا حمید سہروردی متنوع اسالیب کے تخلیق کار ہیں۔

رسمِ اجرا کے فوری بعد شعری نشست منعقد کی گئی جس میں جناب حبیب اللہ آبادی، جناب شبیر اعظمی، جناب یوسف رانا، جناب غنی غازی، جناب شجاع الدین شاہد، جناب رؤف صادق اور ناظمِ تقریب جناب شاذ رمزی نے کلام پیش کیے۔ تقریب میں ملت اسکول کے پرنسپل جناب ناصر اعجاز رسول، جناب محمد اکبر مدرس اور دیگر اصحاب شریک تھے۔

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **چراغ فکر**
شاعر : منظور پروانہ
اشاعت : 2025
ضخامت : 288 صفحات
قیمت : 300 روپے
ناشر : 155/129/33، احاطہ سلیمان قدر، مولوی گنج، لکھنؤ-226018
تبصرہ نگار : عمران عظیم

’چراغِ فکر‘ منظور پروانہ کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل افسانوی ادب پردست حنائی، ادبِ اطفال پر نیکی کا نور اور مجموعۂ مضامین پراعتبار حرف کا انتخاب شائع کر چکے ہیں۔ ان کے تمام افسانے ان کی تخلیقی صلاحیت کے غماز ہیں۔ انھیں اطفال ادب اور ادبی مضامین لکھنے پر بھی قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی دیگر تصانیف میں بھی سماج اور زندگی کے مسائل کا احاطہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں پختگی اور بیان میں شائستگی بھی ہے۔

واضح ہو کہ غزل قافیہ پیمائی کا نام نہیں بلکہ رمز و ایما کا فن ہے۔ شاعر ’اعتراف‘ میں یوں لکھتے ہیں:

’’شمعِ سخن کے جاں نثاروں میں ممتاز ہونے کا دعویٰ نہ کبھی تھا اور نہ ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے تو شاعر ہونے کا بھی دعویٰ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے نہ تو شاعر کا نشہ ہے اور نہ ہی شاعری میرا پیشہ۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے نثر سے لگاؤ ہے اور نثر ہی میرا اصل میدان ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میرے ادبی احباب میں 90 فیصد شاعر ہیں۔ 8 فیصد احباب وہ ہیں جو نثر اور نظم دونوں میں اپنے افکارِ عالیہ کو پیش کرتے ہیں۔ صرف 2 فیصد احباب وہ ہیں جو صرف نثار ہیں انہی احباب میں جن میں نوے فیصد شاعر ہیں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے نتیجے میں اوائلِ عمری کے وہ شعری جراثیم پھر سے متحرک ہو گئے جو ایک عرصے تک خاموش تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سے شعر گڑھنے لگا۔ احباب کے ساتھ شعری نشستوں میں بھی شرکت کرنے لگا۔ اس طرح شاعر ہونے کا ٹھپہ لگ گیا۔ مگر میں ہمیشہ اس سے بچتا رہا، خاص طور پر مشاعرے کی دنیا سے۔ لیکن احباب اور عوام کی نظروں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے اکثر شعری محفلوں میں شرکت کر لیتا تھا، مگر اب اس سے بھی دور ہو گیا ہوں۔‘‘

شاعر کا شعری مجموعہ ’چراغِ فکر‘ جو غزلوں پر مشتمل ہے بغیر دعوے کے اپنے بلند حوصلے کے ساتھ قاری کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ حمد اور نعت کے دو اشعار پیشِ خدمت ہیں:

سنتا ہے بے قرار دلوں کی تو ہی پکار
تیرے ہی اختیار میں دل کا قرار ہے

فضا میں گونج تو ہے نعرۂ رسالت کی
دلوں میں ان کی شریعت کا احترام بھی ہے

اسی طرح غزل کے چند اشعار حاضرِ خدمت ہیں:

روز اس شہر کا پل بھر میں بدلتا ہے مزاج
ہم نے اب چھوڑ دیا شہر میں حیراں ہونا

لباسِ رہ نمائی میں بہت ملتے تو ہیں لیکن
جو منزل تک ہمیں لے جائے وہ رہبر نہیں ملتا

محفلِ شعر و سخن میں بھی ہو کرتب بازی
اچھا لگتا نہیں شاعر کا مداری ہونا

بیٹھی ہیں انتظار میں شیریں صفت کئی
کوئی تو ان کے نام کا تیشہ اٹھائے گا

خیال ہو کہ نہ ہو عرض حال کرنا ہے
نہیں ہے شرط دعا کے لیے اثر رکھنا

کوئی اس کا بھی نکل آئے خریدار کہیں
ہم بھی بازار میں پھرتے ہیں شرافت کے اثر

بجز اداسی زمانے کو اور کیا دوں گا
چراغِ رفتہ کی افسردہ روشنی ہوں میں

سنتے ہیں وہ بے خواب رہا کرتے ہیں اکثر
شاید کہ مری آہوں میں کچھ اب بھی اثر ہے

جہاں سلیقہ، اظہار، ندرتِ خیال اور سب سے بڑھ کر روحِ عصر کی کارفرمائی نہ ہو تو وہ شاعری تو ہو سکتی ہے معیاری شاعری ہرگز ہیں۔ ان کی شاعری میں وارداتِ قلبی کا اظہار ہوا ہے۔ ان کے بعض اشعار تو زبان زدِ خاص و عام کے زمرے میں آتے ہیں اور بعض اشعار معمولی ہیں۔

شاعری دلی جذبات و احساسات اور فکر و خیال کے اظہار کا بہترین اور موثر ذریعہ ہے۔ فنونِ لطیفہ میں شاعری اور شاعری میں غزل امتیازی مقام رکھتی ہے۔ منظور پروانہ کی شاعری میں الفاظ کی آرائش بھی ہے اور دونوں مصرعوں میں ربط کا حسن بھی۔ شاعر نے اپنی چراغ فکر کے توسط سے قاری تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ جدید فکر و فن کے دائرے میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ان کے قاری کو تمام اشعار غور و فکر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان کا شمار عہدِ حاضر کے عمدہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ سلیقے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مجموعے کا سرورق عمدہ و دیدہ زیب ہے۔ کتاب کی اشاعت سے ان کے قاری کی بھی دلچسپی بڑھتی ہے۔ اس کتاب سے شاعر کے عزم و ارادے کی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ میں اس کتاب کی پذیرائی اور صاحبِ کتاب کی تخلیقی پیش رفت کے لیے دعا گو ہوں۔ میرے خیال میں اس مجموعے کو اردو کے تمام کتب خانوں میں موجود ہونا چاہیے۔ ◆◆

محبتوں اور خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

رگِ ظرافت پھڑک اٹھی جو بذاتِ خود ایک اچھے شاعر تھے، کہا کہ جاؤ تمھیں کون روک سکتا ہے، دنیا کا کوئی قانون تمھیں اپنی ماں سے ملنے سے نہیں روک سکتا ہے، اس لیے آپ اپنی ماں سے ملنے جا سکتے ہو۔ ہندستان کا وزیرِ خارجہ تمھیں اجازت دے رہا ہے۔ اور... وزارتِ خارجہ کے عہدیداروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ جلدی جلدی اجازت نامے ویزہ وغیرہ تیار کر کے جانے والوں کے حوالے کیے ہوں گے۔ لگے ہاتھوں پروین کو بھی موقع مل گیا تھا اور وہ پٹنہ گئیں اور وہاں سے چندن پٹی، دربھنگہ جہاں سے ان کے والدین نے ہجرت کی تھی۔ وہ وہاں اپنی پھوپی ڈاکٹر ذیشان فاطمی کے گھر میں ٹھہری تھیں۔ پروین شاکر کے دو خوب صورت شعر حاضرِ خدمت ہیں:

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کی دے تعبیر کون

طلاق دے تو رہے ہو مجھے غرور و فخر کے ساتھ
میرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ

رضوان صاحب سے انٹرویو میں پروین شاکر نے کہا تھا کہ ’’محبت کا فلسفہ میری شاعری کی بنیاد ہے اور اس کے حوالے سے بھی اس ازلی مثلث یعنی انسان، خدا اور کائنات کو دیکھتی اور سمجھتی ہوں‘‘۔

پروین شاکر کے کلام اور ان کے بارے میں کچھ جاننے کے بعد ہمیں یہ احساس ہوا کہ وہ نہ صرف ایک ممتاز شاعرہ تھیں بلکہ اس سے بڑھ کر ایک اچھی انسان بھی تھیں۔ چوں کہ ہزار ہا گلے شکوؤں کے باوجود انھوں نے کبھی بھی شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ان کا پورا کلام اس بات کا گواہ ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب کو جب بھی یاد کیا تو عزت و احترام کے ساتھ کیا اور اس کے لیے دعائیں ہی دعائیں۔ ایسا پاکیزہ اور اچھوتا کلام شاید ہی کسی اور زبان میں بیان کیا گیا ہو۔ ان کی شاعری کا محور محبت اور عورت رہی۔ ان کی ایک اور خصوصیت متکلم کے استعمال کا ہے جو اس سے پہلے اردو شاعری میں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی تھی۔ بعض نقاد پروین شاکر کے کلام کا موازنہ مشہور ایرانی شاعرہ فروغ فرخزادہ سے بھی کرتے ہیں۔ اردو دنیا پروین شاکر کو کبھی نہیں بھولے گی اور ہم ہر سال انھیں یاد کرتے رہیں گے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے رہیں گے۔ محبتوں اور خوشبوؤں کا دیا بجھ تو گیا ہے لیکن ہم ان کی یاد میں ہر سال دیے اور دیپ جلاتے رہیں گے۔ بقولِ ڈاکٹر پیر زادہ قاسم!

سب میری روشنیِ جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا

انجینئر محمود اقبال
جاوید ولا، گراؤنڈ فلور، مکان نمبر 12-2-419/A/3/1
الاپتی نگر، مہدی پٹنم، حیدرآباد-500028 (تلنگانہ)
Mob. No. +91 6309727951
E-mail: abuumarsiddiqi@gmail.com

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

خواجہ الطاف حسین حالی (تحقیق وتنقید کے تناظر میں)

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

حالی نے شیفتہ سے استفادہ کیا۔ غالب سے اصلاح لی۔ غزل میں کلاسکی شعرا کا اثر قبول کیا۔ حالی کے کلام اور خصوصاً غزل پر غالب کے علاوہ مومن، میر، داغ، ذوق اور درد کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں:

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالبؔ کا معتقد ہے مقلد ہے میرؔ کا

حالی کے یہاں سادگی، سلاست، آہستہ روی، الفاظ کی دروبست، فکر وخیال کا سیلِ رواں، برجستہ و برمحل لفظیات، خیالات میں وسعت اور تازگی و لطافت اور براہِ راست جدیدیت کا عنصر، منفرد لہجہ اور محبوب سے تعلق کا نیا انداز حالی کو معاصرین شعرا میں نئی شناخت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں:

عشق سنتے ہیں جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

ہم نے اوّل سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر
ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی

حالی نے نہ صرف شاعری کو نیا صوتی طرز عطا کیا بلکہ لسانی سطح پر بھی نئے امکانات پیدا کیے۔

یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

حالی نے فلسفۂ تصوف، گنجلک پسندی، ثقیل الفاظ، سنگلاخ زمینیں اور مشکل صنعتوں کو اپنے یہاں جگہ دینے سے اجتناب کیا ہے۔ وہ مشکل اور پیچیدہ مسائل اور معاملات کو بھی سہلِ ممتنع میں پیش کر دینے کے طرف دار ہیں۔

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

نظم گوئی حالی کا خاص میدان رہا۔ عربی و فارسی کے علاوہ مغربی علوم وادبیات اور انگریزی زبان سے واقفیت نے حالی اور آزاد دونوں کو بھرپور استفادے کا موقع فراہم کیا۔ انجمن پنجاب کے موضوعاتی نوعیت کے مشاعروں میں شرکت کے بعد ان کے تخلیقی سرچشمے خوب وا ہوئے اور نظمِ جدید کی نئی ہیئتوں اور فارمیٹ میں طبع آزمائی ہونے لگی اور یہ نوبت نثری نظم تک آ پہنچی۔ حالی نے ادبی موضوعات کو وسعت دی اور سیاسی، سماجی، اخلاقی و تعلیمی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی اور خاص طور سے وہ مسلمانوں اور ہندستانیوں سے مخاطب ہوئے جس کا مقصد اصلاحِ معاشرہ تھا۔

'مناجاتِ بیوہ' حالی کی بہت اہم نظم ہے۔ اس نظم میں پہلی بار غزل کے محبوب سے قطعِ نظر ہندستانی عورت کے سماج میں مرتبہ، احساسِ محرومی، رشتوں میں ذہنی کشمکش اور ناروا برتاؤ کے حوالے سے 'مناجاتِ بیوہ' میں خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایک مہربان گو ذرا سخت باپ کے تصور سے زیادہ قریب ہے۔

(بحوالہ محمد حسن عسکری، حالی کی مناجاتِ بیوہ، مضمون، صفحہ 180)

اپنے پرائے کی دھتکاری
میکے اور سسرال پہ بھاری
چین سے جاگی اور نہ سوئی
میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی

نظم 'چپ کی داد' کو حالی کے آخری دور کی نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں عورت کے سماجی تقدس، عصمت اور عظمت کا اعتراف مختلف رشتوں کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

علاوہ ازیں تعلیمی نظموں میں مسلمانوں کی تعلیم، مدرسۃ العلوم اور مسلمانوں کی تعلیم اہم ہیں۔ ان نظموں کے ذریعے حالی نے سرسیّد تحریک کے مقاصد کو کسی حد تک بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ حب الوطنی سے متعلق بھی حالی نے متعدد نظمیں لکھی ہیں۔

حالی نے قصیدے کے فن کو بے جا مبالغہ آرائی اور تصنع سے علاحدہ رکھا۔ حالی کے کلام میں دس قصیدے ملتے ہیں۔ ان میں سات مکمل جب کہ تین نامکمل ہیں۔ ان میں دو قصیدے نعتیہ نوعیت کے ہیں۔ حالی نے وقت اور ضرورت کے پیشِ نظر شاعری کی مختلف اصناف میں چند تبدیلیاں بھی کیں اور تجاویز بھی پیش کرتے رہے۔ شجاعت علی سندیلوی کا خیال ہے کہ ''حالی کی شاعری کا آغاز ہی نعتیہ خمسہ سے ہوتا ہے۔'' حالی کے پہلے نعتیہ قصیدے میں 133 کے قریب اشعار بتائے جاتے ہیں۔

حالی نے صنفِ مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی لیکن روایتی مرثیہ سے قطعِ نظر انھوں نے شخصی مرثیہ کی بنیاد ڈالی۔ حالی کا خیال ہے کہ ''زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں۔''

حالی کے پانچ مرثیے اردو میں ملتے ہیں:

— مرثیۂ غالب (1861)
— بڑے بھائی کا مرثیہ (1885)
— مرثیۂ حکیم محمود خاں (1892)
— ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ (1901)
— محسن الملک کا مرثیہ (1907)

حالی نے کربلا کے روایتی مراثی سے بغاوت کی اور اُردو میں شخصی مرثیہ نگاری کی بنیاد ڈالی اور مختلف فورمیٹ میں مرثیہ لکھے۔ صنفِ مرثیہ کے علاوہ حالی نے رباعیاں بھی کہیں اور قطعات بھی لکھے۔

حالی نے کسی بھی صنف میں طبع آزمائی کی ہو لیکن انھوں نے اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی موضوعات اور تعلیمی و مذہبی موضوعات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔

حالی کے قطعات دلی کی شاعری کا تنزل، مناظرہ، شاعر، سیّد احمد کی تکفیر، سیّد احمد کی مخالفت کی وجہ، آزادی کی قدر، فیشن کی تعریف، قانون اور قوم کی پاسداری، انگریزوں کی بے جا عملداری اور سیاست سے تعلق رکھتے ہیں۔

شجاعت علی سندیلوی نے حالی کی 154 رباعیات کا ذکر کیا ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

دنیائے دوں کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی بڑا کام
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

حالی کی علمی وادبی خدمات اردو کے سرمایے میں غیر معمولی اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں اردو کا پہلا سوانح نگار تسلیم کرلیا گیا ہے۔ حالی کی پانچ سوانح ملتی ہیں ان میں سے ایک سوانح فارسی میں ہے جو حکیم ناصر خسرو پر لکھی تھی اور مولانا عبدالرحمٰن کی سوانح دستیاب نہیں ہے۔ 'حیاتِ سعدیؔ' کے علاوہ 'یادگارِ غالب' اور 'حیاتِ جاوید' کو بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

حالی کی تحریر کردہ سبھی سوانح فنّی تکنیک، استدلالی تقاضوں، متن اور مواد کی فراہمی، نثری اسلوب، شخصیات کی ہمہ گیری اور مستند حوالوں کے ساتھ مشرقی طرز اور اُصولوں پر فنی نقطۂ نظر سے پوری اُترتی ہیں۔

سرسیّد کی فکر کے اثرات حالی نے براہِ راست قبول کیے۔ حالی سرسیّد سے ذاتی طور پر بہت متاثر رہے۔ سرسیّد سے ملاقات کے بعد تقریباً 38 برس کے عرصے میں حالی نے سرسیّد کے مشورے اور اُن کی ایما پر بہت سی تحریریں اور تخلیقات پیش کیں، اس کی ایک بڑی مثال 'مسدس حالی' ہے۔

'مولودِ کعبہ' حالی کی ایک اہم نثری تصنیف ہے۔ 1932 میں اس کتاب کو حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے حالی پریس، پانی پت سے شائع کیا تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد عوام وخواص کو اس کا علم ہوا۔ اس کے بعد 'مجالس النساء' سامنے آئی۔ 1874 اس کا سنِ تصنیف بتایا جاتا ہے۔ انگریز حکومت کے سررشتۂ تعلیم نے حالی کو چار سو روپے کے انعام سے بھی نوازا تھا۔ یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں خواتین کی اُمورِ خانہ داری، بچوں کی تعلیم وتربیت، نفسیات اور پرورش پر خاطر خواہ بحث کی گئی ہے۔

حالی کے مضامین ومقالات کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں مذہبی، اصلاحی، تاریخی، سوانحی، سرسیّد اور علی گڑھ سے متعلق مضامین اور دیگر موضوعات پر متفرق نوعیت کے مضامین شامل ہیں۔

حالی کا پہلا مضمون 'سیّد احمد خاں اور اُن کا کام' کے عنوان سے 1876 میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ 'الدین یسر' 1879 میں 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوا، بعد ازاں مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے اہم مضامین میں تدبیر، مسلمانوں میں مسئلۂ خیرات، سرسیّد کی مذہبی خدمات، مدرسۃ العلوم، مسلمانانِ علی گڑھ، زمانہ، مزاج، موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے، اخبار نویسی اور اس کے فرائض، مدعیانِ تہذیب کی بداعمالیاں، قرونِ اولیٰ کی حق گوئی وحق پسندی شامل ہیں۔ 'زبان گویا' اس مضمون میں اصلاحِ زبان پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

حالی نے حکیم وحید الدین کے عربی قصیدے کا ترجمہ 'ترجمہ قصیدۂ عربیہ' کے نام سے کیا تھا، جو کتابی شکل میں 1906 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی تراجم کیے جو دستیاب نہیں ہیں۔

مقالہ نگار ہونے کے ساتھ وہ ایک اعلا پایے کے خطیب اور تعلیمی مدبر بھی تھے۔ ان کے خطبات اور لکچرز کی بھی خاصی تعداد ہے۔ حالی اپنے لکچرس میں ہمدردی، اصلاحی ترقی، مسلمانانِ پانی پت، مختلف تعزیتی جلسوں اور مدارس کے مذہبی پروگراموں میں تعلیم کے فرسودہ نظام اور نصاب کی کمزوریوں اور خامیوں پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔

حالی ایک منفرد تبصرہ نگار بھی تھے۔ ان کا پہلا تبصرہ مولوی ذکاء اللہ کی کتاب 'تاریخِ ہندستان' پر ہے جو بہت جامع اور مستند تسلیم کیا گیا۔ مکتوب نگاری کی حیثیت سے بھی حالی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ان کے خطوط میں سنجیدگی، متانت اور زندگی کے گہرے مشاہدے کی اصلاحی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کے خطوط شبلی، سرسیّد، پیارے لال شاکر میرٹھی، سیّد امام الدین اور دیگر احباب کے نام بڑے معنی خیز اور ذاتی نوعیت کے ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی کی شخصیت کے مختلف پہلو اور مختلف جہتیں ہیں۔ یہاں ہم نے حالی کے فن کو تخلیق وتنقید کے تناظر میں پرکھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-202002، یوپی
E-mail: zia_musafe@yahoo.co.in

خواجہ الطاف حسین حالی

تخلیق و تنقید کے تناظر میں

ضیاء الرحمٰن صدیقی

خواجہ الطاف حسین حالی کے نام کے ساتھ کبھی لفظ 'پانی پتی' نہیں لکھا جاتا جب کہ ان کی پیدائش اور وفات پانی پت ہی میں ہوئی۔ اگرچہ حالی نے اپنے وطنِ مالوف پانی پت سے گہری ذہنی وابستگی اور وہاں کے اساتذہ اور صوفیہ سے ہمیشہ والہانہ لگاؤ اور ارادت مندی کا اظہار کیا۔ ان کی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیاں بھی اسی سرزمین پر پروان چڑھیں۔

1837 سے 1914 تک کا عرصہ حالی کی علمی، ادبی اور ملّی خدمات کے لیے مختص رہا جو تقریباً 77 برس کے عرصہ کو محیط ہے۔ حالی کو اوائل عمر ہی سے علم وفن کی تشنگی رہی، اور حصولِ علم کے لیے انھوں نے دہلی کا سفر کیا۔ غالباً نو برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوا تو انھیں بہت مایوسی ہوئی اور بے سائیگی کا احساس ہونے لگا۔ کم عمری ہی میں قرآن مجید پڑھا، بعدازاں دینی علوم کی جانب توجہ مبذول کی۔ حدیث، فلسفہ، منطق، فقہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ان کی شادی کر دی گئی۔ بعدازاں دہلی کا سفر کیا اور 1854 میں دہلی جا کر مولوی نوازش علی سے تعلیم مکمل کی۔ ایک برس بعد یعنی 1855 میں دہلی سے پانی پت واپس آ گئے۔ 1856 میں حصار میں کلکٹری آفس میں ملازم ہو گئے، لیکن 1857 کے غدر کے دوران پانی پت واپس آنا پڑا۔ پھر چند برس بعد دہلی کا سفر اختیار کیا اور دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جو اُن دنوں جہانگیر آباد کے نواب تھے، ان کے بیٹوں کو اتالیق کے طور پر تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مسلسل اتالیقی کے فرائض انجام دیے۔ شیفتہ کی علمی و ادبی صحبتوں سے اشعار کہنے کا شوق بڑھتا گیا اس دوران غالب سے ملاقات ہوئی۔ غالب سے اصلاح لینے لگے۔ بعدازاں لاہور میں کچھ عرصہ سررشتۂ تعلیم میں کتابوں کی عبارت درست کرنے کے سلسلے میں ملازمت کی۔ یہ مسودے انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ ہوا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھا اور کرنل ہالرائڈ جو اُن دنوں ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ ان کی سرپرستی میں محمد حسین آزاد نے ماہانہ مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے میں قومی اور نیچرل طرز کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اس مشاعرے میں حالی نے اپنی کئی مشہور نظمیں پڑھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ آٹھ ماہ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے، پھر دہلی واپس آ گئے۔ اور دہلی کے ایک مشہور اسکول یعنی اینگلو عربک اسکول میں استاد مقرر ہوئے۔ یہاں ان کی ملاقات سرسیّد احمد خاں سے ہوئی۔ سرسیّد سے ملاقات کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی کی ادبی اور تخلیقی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور سرسیّد کی تحریک وایما پر حالی نے اپنی مشہور مسدس لکھی۔ 1887 میں جب سرآغا خان علی گڑھ تشریف لائے تو سرسیّد نے حالی کی ملاقات نواب سے کرائی اور نظام سرکار سے انھیں 75 روپے ماہانہ علمی وظیفہ ان کے علمی کارناموں کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ بعد ازاں یہ وظیفہ سو روپے کر دیا گیا اور وہ ہمیشہ علمی و ادبی خدمات میں مصروف رہے۔ 77 برس کی عمر پائی۔ 1914 میں پانی پت ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔

حالی نے اپنے تخلیقی وعلمی سفر کے دوران اُردو کے ادبی سرمایے میں بیش قیمت اضافے کیے اور سرسیّد تحریک کے فروغ وارتقا میں بھی اپنی گراں قدر خدمات پیش کیں۔

حالی ادبی وتنقیدی نظریہ ساز، انشا پرداز، صاحب طرز ادیب، سوانح نگار، عظیم شاعر تھے۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزل کے علاوہ مرثیہ، قطعہ، قصیدہ، مسدس، پابند نظم میں نئے موضوعات کو جگہ دی اور اپنی شاعری کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ کو ترجیح دی۔ غزل اور قصیدہ کی بعض خامیوں کو واضح کیا۔

حالی کے کلام میں جذبات کا تقدس، دردمندی اور سادگی و سلاست کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ حیاتِ سعدی، مقدمۂ شعروشاعری، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید کو بقائے دوام حاصل ہے۔

حالی نے اردو شاعری خصوصاً نظم کو جدید موضوعات، جدید طرز اور جدید لہجہ عطا کیا۔ حالی نے انقلاب 1857 میں دہلی کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اگرچہ غالب سے اصلاح لیتے تھے لیکن سب سے زیادہ استفادہ حالی نے شیفتہ سے کیا۔ غزل میں مومن کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

'مرثیۂ دہلی' میں دہلی کی تباہی اور غارت گری کا حال واضح طور پر نظر آتا ہے۔

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

انگریزوں کے ظلم واستحصال، بے جا عملداری اور تسلّط کا بیان 'مسدسِ حالی' کے دیباچے میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جا رہے ہیں۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پرواہ ہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔''

حالی نے قوم کی زبوں حالی، بے علمی، تعلیمی بے راہ روی اور نازیبا عمل اور خراب عادتوں کا نقشہ مسدس میں پیش کیا ہے۔

حالی نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں جس کی بنیاد 1874 میں محمد حسین آزاد نے ڈالی تھی اور اس مشاعرے میں مصرع طرح پر نظم کہنا ہوتی تھی، اسی زمانے میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایما پر مشاعرے میں پڑھنے کے لیے چار مثنویاں لکھیں۔ ایک مثنوی 'برسات'، دوسری 'اُمید'، تیسری 'رحم وانصاف' اور چوتھی مثنوی 'حبِ وطن' پر لکھی تھی۔

شیفتہ نے بھی حالی کی ذہن سازی کی تھی۔ سرسیّد اور حالی دونوں ہی اصلاحی ذہن کے حامل تھے۔ سرسیّد ترجمے کے ذریعے مغربی علوم کے حصول کو ایک اہم کام تصور کرتے تھے۔ حالی نے مغربی علوم کے اردو تراجم کو ذہن میں رکھتے ہوئے جیولوجی کے موضوع پر عربی سے اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ فرنچ سے عربی میں کسی مصری عالم نے کیا تھا۔

معین احسن جذبی نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ''سرسیّد کے یہاں اگر دین کے مقابلے میں دنیا پر زور ہے تو حالی بھی دین وملّت کا انحصار دنیاوی ترقیوں پر رکھتے ہیں۔''

حالی نے تعلیم نسواں اور مساواتِ نسواں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ عورتوں اور بچوں کی ذہنی تربیت کے موضوع پر 'مجالس النساء' کے عنوان سے باضابطہ ایک کتاب بھی تصنیف کی کیوں کہ انھوں نے دیگر مذاہب اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔

حالی اور غالب میں غزل کے حوالے سے ذہنی مطابقت بھی رہی۔ دونوں میں باہمی ربط اس قدر تھا کہ حالی نے غالب کی سوانح 'یادگارِ غالب' لکھ کر اس کا حق ادا کیا۔

اسلوب احمد انصاری نے 'نقش ہائے رنگ رنگ' میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''حالی نے غالب کی اردو شاعری میں حذفِ عبارت یعنی Ekpsis کی صفت کے استعمال کا بھی ذکر کیا ہے۔ موجودہ تنقیدی اصطلاح میں آپ اسے Semantic Gap بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شعر میں ایسے کھانچے چھوڑ دیے جاتے ہیں جنھیں قاری اپنی قوتِ متخیلہ کو بروئے کار لا کر اپنی طور سے انھیں پُر کرنے کی سعی کرے۔''

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، روڈگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***